مولانا محمد عبدالرشید نعمانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مسلمانوں کے علمی خدمات

مندرجہ ذیل مقالہ اپنے مغز و مفہوم، معلومات، اور انداز بیان کے اعتبار سے ایک خاص حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن یہ موضوع اتنا طویل ہے کہ اس کا صرف ایک گوشہ ہی سامنے آسکا ہے۔ درحقیقت یہ موضوع ایک مستقل تالیف کا طالب ہے۔

میری تحریر کا موضوع اپنی وسعت کے لحاظ سے اس قدر پھیلا ہوا ہے کہ بڑی بڑی ضخیم جلدوں میں بھی اس کا سمیٹنا مشکل ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ ایک گھنٹہ کی مختصر سی مدت میں اس موضوع پر سوائے ایک طائرانہ نظر ڈالنے کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ بدیں وجہ اس موضوع پر میں اس وقت جو کچھ کہوں گا وہ مسلمانوں کے کام کی صرف ایک اجمالی فہرست ہوگی۔ یا ان کی بے شمار خدمات کا ایک ادنیٰ سا نمونہ۔

عام طور پر علم کی دو قسمیں کی جاتی ہیں ایک علم معاش، دوسرا علم معاد۔ اس کائنات ہست و بود میں حضرت انسان نے اپنی بقاء کے لیے جن علوم کو مرتب و مدوّن کیا ہے وہ سب علم معاش میں داخل ہیں کہ جن کی افادیت سرتاسر اسی دنیوی زندگی تک محدود ہے۔ اور جن علوم سے آخرت کی زندگی بنتی ہے اور خدا کی رضا نصیب ہوتی ہے ان کا تعلق علم معاد سے ہے۔ جن کا اصل ثمرہ تو آخرت ہی میں ملے گا تاہم ان پر عمل کرنے سے انسان دنیوی برکتوں سے بھی محروم نہیں رہتا۔

مسلمانوں کا اصل کارنامہ تو علوم وحی کی حفاظت ہے اور یہ وہ کارنامہ ہے کہ جس میں دنیا کی کوئی قوم ان کا شریک وسہیم ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ رہے دنیوی علوم تو اس میں بھی مسلمان دوسری قوموں سے پیچھے نہیں رہے بلکہ جس طرح ہر قوم نے اپنے عروج واقتدار کے زمانے میں انسانی تمدن وتہذیب کے ارتقاء میں حصہ لیا ہے اسی طرح مسلمانوں نے بھی اپنے عہد اقتدار میں علوم دنیویہ کو ترقی دینے اور ان کو بام عروج پر پہنچانے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ چنانچہ طب وسائنس میں جو ان کی ایجادات واختراعات ہیں ان کی تفصیل 'تاریخ الحکماء' قفطی اور 'طبقات الاطباء' ابن ابی اصیبعہ اور 'تاریخ التمدن الاسلامی' جرجی زیدان کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتی ہیں۔ یورپ اگرچہ موجودہ دور میں مادی ترقی کے اندر ہم سے آگے ہے تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی یہ ساری علمی ترقی اور موجودہ سائنس کا ارتقاء مسلمان فلاسفہ وعلمائے طبیعیات کی تحقیقات واکتشافات ہی کا مرہونِ منت ہے اور اگر مسلمانوں کی گذشتہ کوششیں فلسفہ وسائنس کے بارے میں نہ ہوتیں تو یورپ ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔

علوم دنیویہ کے سلسلہ میں سب سے پہلا تحریری سرمایہ جو عربی زبان میں منتقل ہوا وہ علم طب کی چند کتابیں تھیں جن کو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے طبیب خاص ابن آثال نے ان کے استعمال کے لیے عربی زبان میں منتقل کیا تھا۔ علامہ ابن ابی اصیبعہ نے اپنی مشہور کتاب 'طبقات الاطباء' میں ماسرجویہ طبیب کے تذکرہ میں تصریح کی ہے کہ طبیب موصوف کی ایک کتاب جو اس نے سریانی زبان سے عربی میں ترجمہ کی تھی خلیفہ عادل امیر المومنین حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو کتب خانۂ سرکاری میں ملی تھی، اور حضرت ممدوح نے افادۂ عام کی غرض سے کتب خانہ سے نکلوا کر اس کتاب کے نسخے شائع کرائے تھے۔ حضرت امیر معاویہؓ کے پوتے خالد بن یزید کے متعلق علامہ ابن الندیم نے کتاب الفہرست میں لکھا ہے کہ یہ کیمیا اور سائنس میں بڑا فاضل تھا اور حکیم کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ اس کے علمی شغف کا یہ حال تھا کہ مصر میں اس کے عہد میں فلسفہ یونان کے جو عالم فصیح عربی لکھنے پر قادر تھے اس نے ان کو یکجا جمع کیا اور حکم دیا

کہ طب نجوم اور کیمیا کی جو کتابیں یونانی اور قبطی زبانوں میں ہیں ان کے ترجمے عربی زبان میں کیے جائیں۔ چنانچہ ان فنون کی بہت سی تصنیفات خالد کی فرمائش پر عربی زبان میں منتقل ہوگئیں۔ خالد خود بھی مصنف تھا۔ علامہ ابن الندیم نے کتاب الفہرست میں طب و سائنس پر اس کی متعدد تصانیف کے نام گنائے ہیں۔

خلیفہ عبدالملک کے عہد تک مال گذاری اور خراج کے جتنے دفاتر تھے سب غیر زبانوں میں تھے۔ چنانچہ عراق کا دفتر فارسی میں تھا۔ شام کا لاطینی میں اور مصر کا قبطی میں اور اسی وجہ سے دفتر مال گذاری میں جتنے عہدہ دار تھے سب کے سب مجوسی یا نصرانی تھے۔ حجاج بن یوسف خلیفہ عبدالملک کی طرف سے عراق کا گورنر تھا۔ اتفاق کی بات کہ اس کے افسر مال فرخ نے جو مجوسی تھا ایک مرتبہ یہ کہہ دیا کہ میرے بغیر خراج کا دفتر چل ہی نہیں سکتا۔ حجاج کو جو اس کے اس مغرورانہ دعویٰ کی اطلاع ہوئی تو سخت برہم ہوا اور فوراً صالح بن عبدالرحمن کو جو اس کا ندیم خاص تھا اور عربی و فارسی دونوں زبانوں میں کمال رکھتا تھا حکم دیا کہ خراج کا سارا محکمہ فارسی سے عربی میں منتقل کر دیا جائے۔ یہ حکم سن کر دربار کے جتنے پارسی تھے سخت پریشان ہوئے کہ اتنا بڑا محکمہ ہمارے ہاتھ سے نکلا جاتا ہے۔ آخر سب نے مل کر صلاح کی کہ صالح کو رشوت دے کر اس کام سے باز رکھا جائے۔ چنانچہ اس غرض کے لیے ایک لاکھ روپیہ لے کر صالح کے پاس پہنچے کہ یہ آپ کی نذر ہے آپ براہ کرم حجاج کو سمجھا دیں کہ عربی زبان میں دفتر مال کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس زمانے کا مسلمان آج کے دعویداران اسلام کی طرح نہ تھا۔ صالح نے مجوسیوں کی اس رشوت کو حقارت سے ٹھکرا دیا اور عراق کا تمام دفتر عربی زبان میں منتقل کر دیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد دوسرے صوبوں میں بھی دفتر مال کو عربی زبان میں کر دیا گیا۔

خلیفہ ہشام بن عبدالملک اموی کا میر منشی سالم بڑے پایہ کا انشا پرداز اور صاحب قلم تھا اس کے ساتھ غیر زبانوں میں بھی اس کو کمال حاصل تھا اور فلسفہ و سائنس کا ذوق آشنا تھا۔ اس نے ارسطو کے ان رسالوں کا جو سکندر کے نام تھے عربی زبان میں ترجمہ کیا۔ اسی سالم کا

بیٹا جبلہ فارسی زبان میں کمال رکھتا تھا اس نے فارسی سے بہت سی کتابیں عربی میں ترجمہ کیں۔ سالم ہی کی رغبت پر اس عہد کے اور لوگوں نے بھی بہت سی تصنیفات کو عربی میں منتقل کیا خود خلیفہ ہشام کو بھی اس کام سے خاص دلچسپی تھی۔ سلاطین عجم کے شاہی ذخیرے جو مسلمانوں کے ہاتھ آئے تھے ان میں ایک نہایت مفصل تاریخ بھی تھی۔ جس میں ملوک عجم کے حالات، قواعد سلطنت، تعمیرات اور علوم وفنون کی تفصیل تھی۔ ہشام نے اس کتاب کے ترجمے کا حکم دیا۔ اور ۱۱۳ھ میں یہ ترجمہ تیار ہوکر مکمل ہوگیا۔ مؤرخ مسعودی کے 'التنبیہ والاشراف' میں اس کتاب کے بارے میں یہ الفاظ ہیں کہ

"میں نے ۳۰۳ھ میں بمقام اصطخر یہ کتاب مع تصاویر دیکھی تھی۔ سلطنت فارس کے متعلق جس قدر کتابیں قدیم فارسی میں موجود ہیں ان میں کوئی کتاب اس قدر مفصل اور مبسوط نہیں ہے۔"

پھر خلیفہ منصور عباسی کے عہد سے باقاعدہ اور منظم طور پر علوم دینیہ کی تدوین وترتیب پر توجہ مرکوز کی گئی۔ چنانچہ اس کے حکم سے فن طب، ہیئت، فلسفہ، منطق وغیرہ کی بہت سی کتابیں جو یونانی، سریانی، کلدانی، سنسکرت اور فارسی زبانوں میں تھیں ان کا عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ فارس کے تمام علوم وفنون عربی میں منتقل ہوئے۔ فن تاریخ، علم اخلاق اور سیاست گری سے متعلق جو کچھ فارسی میں ذخیرہ تھا سب عربی میں آگیا۔ علامہ ابن الندیم نے کتاب الفہرست میں ان تمام موضوعات سے متعلق تمام کتابوں کو نام بنام گنایا ہے۔

منصور ہی کے زمانے میں ہندو فلاسفہ کی بغداد میں آمد شروع ہوئی، اور سنسکرت کی اکثر عمدہ تصنیفات کا عربی میں ترجمہ ہوگیا۔ جس میں وہ مشہور زیچ بھی ہے جس کا نام "سدھانتا" ہے۔ خلیفہ مامون کے عہد تک اعمال کواکب میں اسی تاریخ پر اعتماد کیا جاتا تھا۔ منصور نے علوم یونان کے سلسلہ میں اس سرمایہ پر اکتفا نہ کرتے ہوئے جو اس کے قلمرو خلافت میں موجود تھا خود قیصر روم کو خط لکھا اور اس نے منصور کی فرمائش پر فلسفہ وحکمت کی بہت سی کتابیں دار الخلافہ کو روانہ کیں جن کا ترجمہ عربی میں کیا گیا۔

ہارون الرشید جب تخت خلافت پر متمکن ہوا تو اس وقت تک یونانی، سریانی، فارسی، قبطی اور سنسکرت وغیرہ کی تصنیفات کا ایک عظیم الشان ذخیرہ دارالخلافہ میں جمع ہو چکا تھا ہارون الرشید نے اس تمام ذخیرہ کو محفوظ کرنے کے لیے ایک عظیم الشان محکمہ کی بنیاد ڈالی اور اس کا نام "بیت الحکمۃ" رکھا۔ اس محکمہ میں ہر مذہب و ملت کے لوگ جو مختلف زبانوں کے ماہر تھے ترجمہ کے کام پر مامور ہوئے۔ ہارون الرشید کی جب قیصر روم سے جنگ ہوئی اور ایشیائے کوچک میں اس کو پے در پے فتوحات حاصل ہوئیں تو ان فتوحات میں مفتوحہ شہروں کے اندر بے شمار یونانی کتابیں اس کے ہاتھ لگیں جن کو اس نے بحفاظت تمام بیت الحکمۃ میں داخل کر دیا۔ اور یوحنا بن ماسویہ کے زیر نگرانی ان کے ترجمے کا کام شروع ہو گیا۔ ہارون کے بعد جب اس کے خلف الرشید مامون کا دور آیا تو اس کے عہد زریں میں عربی زبان تمام دنیا کے علوم و فنون سے مالا مال ہو گئی۔ اور علوم عقلیہ میں مسلمانوں نے وہ ترقی کی کہ باید و شاید۔ اب صرف ترجمہ نہیں بلکہ ان علوم و فنون میں اجتہاد کا دروازہ کھلا اور بڑے بڑے باکمال لوگ پیدا ہوئے اور پھر تحقیق علوم کا ذوق عہد بعہد بڑھتا ہی چلا گیا جس کے نتیجہ میں امت اسلامیہ میں ایسے ایسے بلند پایہ فلسفی، حکیم، مہندس، ریاضی دان اور طبیب پیدا ہوئے کہ دنیا ایک ہزار برس تک ان کی نظیر پیش کرنے سے عاجز رہی۔ تاریخ کے اوراق ان نامور حکماء اور فلاسفہ کے تذکرہ اور حالات سے معمور ہیں۔

مسلمانوں نے علوم عقلیہ میں ہر فن پر جو نادر اور بیش بہا تصانیف یادگار چھوڑی ہیں ان کا اگر ایک سرسری جائزہ لینا ہو تو ابن الندیم کی کتاب الفہرست اور کشف الظنون، اور اس کے ذیل کا مطالعہ کافی ہو گا۔ میں نے سرسری جائزہ اس لیے کہا کہ ان کتابوں میں مسلمان علماء فلسفہ و سائنس کی جن تصانیف کو بیان کیا گیا ہے گو ان کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہو کر ہزاروں تک پہنچ جاتی ہے تاہم وہ اس سلسلہ میں مسلمانوں کی کل تصانیف کا عشر عشیر بھی نہیں۔ حکماء و فلاسفہ کے حالات اگرچہ ہر دور کے تذکرہ و تراجم کی کتابوں میں بکثرت مذکور ہیں لیکن خاص

حکماء کے حالات پر ابن صاعد اندلسی، علامہ شہرستانی اور جمال الدین قفطی وغیرہ نے مستقل کتابیں لکھی ہیں جن میں قفطی کی "تاریخ الحکماء" عرصہ ہوا کہ طبع ہو کر شائع ہو چکی ہے، اور خاص اطباء کے حالات پر ابن ابی اصیبعہ اور ابن جلجل اندلسی وغیرہ نے تصنیفیں کی ہیں۔ ابن ابی اصیبعہ کی "طبقات الاطباء" بھی مکرر طبع ہو چکی ہے۔ یہ علوم دنیویہ یا علم معاش میں مسلمانوں کے کارناموں کی ایک ہلکی سی جھلک تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کی علمی مساعی نہ ہوتیں تو مصر و یونان، اور ہند و فارس کے تمام علمی ذخیرے آج برباد ہو چکے تھے۔ یہ مسلمان ہی تھے جنھوں نے عہد وسطیٰ میں دنیا کی تمام قوموں کا علمی سرمایہ اپنی زبان میں منتقل کیا اور پھر ہر فن میں وہ ترقی کی اور ایسے ایسے مسائل ایجاد کیے کہ جو ہند و روم اور یونان و فارس کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آئے تھے۔ ان علوم میں مسلمانوں کا موجودہ لٹریچر ان کی عظمت شان پر شاہد عدل ہے۔

رہے علوم دینیہ تو ان کا تو پوچھنا ہی کیا۔ تمام دنیا میں یہ صرف مسلمانوں ہی کی خصوصیت ہے کہ انھوں نے اپنے پیارے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ایک ایک ادا اور ایک ایک بات کو جوں کا توں بعینہٖ آج تک اسی طرح محفوظ رکھا ہے

ہنوز آں ابر رحمت درفشاں است　　　خم و خمخانہ با مہر و نشان است

قرآن کریم کا ایک ایک لفظ بلکہ ایک ایک حرف مع زیر و زبر اور تشدید کے آج تک مسلمانوں کے سینے میں بعینہٖ محفوظ چلا آتا ہے۔ فن تجوید و قرأت کیا ہے یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لہجہ کا بیان ہے کہ آپ نے فلاں آیت یا فلاں لفظ کو اس صفت کے ساتھ ادا کیا تھا۔ اس زمانہ میں ٹیپ ریکارڈ نہ تھا۔ مسلمانوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز ادا کو محفوظ رکھنے کے لیے اس عظیم الشان فن کی بنیاد ڈالی۔ قرآن کریم کی طرز تحریر کی حفاظت کے لیے ایک دوسرا مستقل فن ایجاد ہوا جس کا نام ہے "علم رسم خط القرآن"۔ اگلے زمانے میں قرآن مجید کی طرح حدیث کے بھی حافظ ہوا کرتے تھے۔ بلکہ ہمارے اسلامی لٹریچر میں یعنی عربی تذکرہ و تراجم

کی کتابوں میں جب بھی کسی عالم کے حق میں "الحافظ" کا لفظ استعمال ہو گا تو اس سے ہمیشہ حافظ حدیث ہی مراد لیا جائے گا۔ کتب حدیث میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اور احوال و اوصاف سے متعلق ایک ایک چیز مکمل طور پر محفوظ ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی حفاظت۔ ایک طرف اس امت نے تو ہر اس شخص کا تذکرہ محفوظ رکھا ہے جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت کوئی ایک بات بھی بیان کی تھی۔ حفاظ حدیث کے حالات پر بیس سے زیادہ کتابیں اب تک ہمارے علم میں آچکی ہیں جن میں سے سترہ کتابوں کا تفصیلی تعارف ہم اپنی کتاب "امام ابن ماجہ اور علم حدیث" میں کرا چکے ہیں۔ پھر قرآن و حدیث کے الفاظ کی صحیح شکل کو سمجھنے کے لیے علم صرف کی تدوین ہوئی۔ عبارت کو صحیح پڑھنے کے لیے علم نحو ایجاد ہوا۔ مفردات کا ماخذ معلوم کرنے کی غرض سے علم اشتقاق وجود میں آیا۔ مفردات کے معانی و مفاہیم جاننے کے لیے علم لغت مدون ہوا۔ قرآن مجید کے اعجاز اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جوامع الکلم کی گہرائی تک پہنچنے کے لیے علم معانی و بلاغت کا وجود ہوا۔ آیات قرآن کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے علم تفسیر کی بنیاد پڑی۔ نصوص کی دلالت اور احکام اسلامی کی حیثیت کو متعین کرنے کے لیے اصول فقہ کی تدوین ہوئی۔ احکام اسلامی کی تفصیل و تفریع کی غرض سے فقہ کا عظیم الشان فن ظہور میں آیا۔ اخبار آحاد کی جانچ پڑتال کے لیے ایک طرف علم اصول حدیث کی داغ بیل پڑی اور دوسری طرف فن جرح و تعدیل اور اسماء الرجال مرتب ہوا۔ اسلام پر مخالفین کے اعتراضات کا جواب دینے کے لیے علم کلام ایجاد ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات و غزوات کی تفصیل کے لیے علم مغازی و سیر مرتب ہوا۔ تصفیہ باطن کی غرض سے علم تصوف کی تہذیب و ترتیب عمل میں آئی۔ پھر ان علوم میں سے ہر فن شاخ در شاخ ہوتا چلا گیا۔ اور ہر شعبہ پر الگ الگ کتابیں لکھی جاتی رہیں۔ مثال کے طور پر صرف ایک علم اصول حدیث کو لے لیجیے۔ ابن صلاح نے اپنی مشہور کتاب "مقدمہ علوم حدیث" میں اس فن کی ۶۵ انواع کا ذکر کیا اور ہر نوع پر محدثین نے مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ مشہور ترک عالم علامہ طاش کبری زادہ نے اپنی کتاب "مفتاح السعادۃ و مصباح السیادۃ" میں جو

موضوعات علوم پر ان کی بہترین کتاب سمجھی جاتی ہے، علوم دینی و دنیوی کے سلسلہ میں تین سو سولہ بنیادی علوم کی نشاندہی کی ہے اور اگر ان علوم کے مختلف شعبوں پر نظر ڈالی جائے تو یہ تعداد ہزاروں سے متجاوز ہو جائے گی اور مسلمانوں نے ہر علم کے ہر شعبہ پر مستقل قلم اٹھایا ہے۔ عارف ربانی علامہ عبدالوہاب شعرانی نے "المیزان الکبریٰ" میں اپنی ایک کتاب "الجوہر المصون و السر المرقوم فیما تنتجہ الخلوۃ من الاسرار و العلوم" کے بارے میں لکھا ہے کہ "اس میں صرف قرآن عظیم سے متعلق تقریباً تین ہزار علوم کا ذکر ہے۔"

پھر ان علوم کی تحصیل اور ان کی ترتیب و تدوین میں جو مشقتیں مسلمانوں نے اٹھائی ہیں وہ ایک الگ باب ہے۔ امام ابوحنیفہ کے متعلق علامہ مسعود بن شیبہ سندھی نے مقدمہ کتاب التعلیم، میں تصریح کی ہے کہ انھوں نے طلب علم میں دو لاکھ کی رقم خرچ کی تھی۔ انھیں کے مشہور شاگرد امام محمد بن حسن شیبانی کا بیان ہے کہ مجھے اپنے باپ کے ترکہ میں تیس ہزار درم ملے تھے جن میں سے پندرہ ہزار شعر و ادب کی تحصیل میں خرچ ہوئے اور پندرہ ہزار حدیث و فقہ کی تعلیم پر۔ اور امام محمد کے شاگرد ہشام بن عبیداللہ الرازی (جو امام موصوف سے "جامع کبیر" کے راوی ہیں) ان کے متعلق حافظ ذہبی نے "تذکرۃ الحفاظ" میں لکھا ہے کہ انھوں نے سات لاکھ کی رقم تحصیل علم میں صرف کی تھی۔ اسی طرح حافظ کبیر ابن سنجر نے نو ہزار اشرفیاں، حافظ ابن رستم نے تین لاکھ درم اور علامہ ذہبی نے ڈیڑھ لاکھ درم طلب علم میں خرچ کیے تھے۔ حافظ ابوبکر جوزقی کی نسبت "تذکرۃ الحفاظ" میں مذکور ہے کہ انھوں نے طلب حدیث میں ایک لاکھ درہم خرچ کیے۔ اور جس علم کو اتنا گراں خریدا اس کو کبھی ارزاں نہیں بیچا یعنی اس کے ذریعہ سے کبھی دنیا نہیں کمائی۔ اسی طرح حافظ حدیث علی بن عاصم کا بیان ہے کہ آغاز طالب علمی میں والد بزرگوار نے مجھے ایک لاکھ درم دیے اور کہا کہ بیٹا یہ لاکھ درم لو اور یاد رکھو کہ ان لاکھ درموں کے عوض ایک لاکھ حدیثیں یاد کرنا ہوں گی۔ ہونہار بیٹے نے بلند حوصلہ باپ کی توقع کو ضائع نہیں کیا اور طلب حدیث میں وہ کوشش

کی کہ حفاظ حدیث میں بار ملا اور اعیان محدثین میں شمار ہونے لگے۔ یہ اہل ثروت اور ارباب تموّل کا حال تھا۔ اب ذرا دوسرا رخ ملاحظہ ہو۔ افلاس کی مار ایسی ہوتی ہے کہ آدمی اپنا سارا حوصلہ کھو بیٹھتا ہے۔ لیکن مسلمانوں کی تاریخ میں ایسے ایسے بلند ہمت اور صاحب حوصلہ بزرگ آپ کو بکثرت نظر آئیں گے کہ جن کے شغل علمی پر افلاس کا مطلق اثر نہ ہوا۔

امام بخاریؒ کا مشہور واقعہ ہے کہ ایام طالب علمی میں ان کو ایک سفر میں تنگ دستی نے اتنا مجبور کیا کہ کئی دن تک جنگل کی بوٹیوں پر گذارہ کرنا پڑا۔ انھیں کے معاصر شیخ الاسلام بقی بن مخلد نے جو اندلس کے مشہور امام اور بڑے پایہ کے محدث گزرے ہیں، زمانہ طالب علمی میں بے مائگی کے سبب ایک مدت تک صرف چقندر کے پتے کھا کر اپنا کام چلایا۔ مشہور حافظ حدیث حجاج بغدادی کا واقعہ ہے کہ جب وہ شعبہ کے پاس سماع حدیث کو جانے لگے تو ان کی مالی مقدرت اس سے زیادہ نہ تھی کہ ان کی والدہ نے سوکھے پکا کر ان کے ساتھ کر دیے اور یہ ان کلچوں کو ایک گھڑے میں بھر کر اپنے ساتھ لیتے گئے۔ روٹیاں ان کی مہربان ماں نے پکا دی تھیں، سالن انھوں نے خود ہی تجویز کر لیا، اور وہ بھی اتنا کثیر اور وافر کہ آج ہزار برس کی مدت گزر جانے کے باوجود ویسا ہی خوشگوار اور خوش ذائقہ ہے۔ وہ کیا دجلہ کا آب رواں۔ معمول تھا کہ حجاج روزانہ ایک روٹی دجلہ کے پانی میں بھگو کر کھا لیتے اور استاذ کے حلقہ درس میں شامل ہو جاتے جس روز روٹیاں ختم ہو گئیں اسی روز استاذ کے آستانۂ علم سے رخصت ہونا پڑا۔

اس سے بھی زیادہ موثر حکایت حافظ ابن المقری، حافظ ابو الشیخ اور امام طبرانی کی ہے کہ یہ تینوں شیخ عصر ایک زمانہ میں مدینہ منورہ میں طلب علم کی غرض سے مقیم تھے۔ اسی اثنا میں ان پر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ رہا سہا جو کچھ پاس تھا سب خرچ ہو گیا، اور نوبت فاقوں کی آگئی۔ روزے پر روزہ رکھا۔ آخر جب بھوک سے بیتاب ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا توسل ڈھونڈا۔ تینوں روضۂ اقدس پر حاضر ہوئے اور

مؤدبانہ عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ الجوع۔ اس کے بعد طبرانی تو وہیں بیٹھ گئے۔ کہنے لگے کہ موت آئے گی یا روزی اور ابن المقری اور ابوالشیخ اپنی قیام گاہ پر لوٹ آئے۔ بھلا یہ صدا کب خالی جانے والی تھی۔ ذرا دیر نہ گذری تھی کہ کسی نے آکر دروازہ پر دستک دی۔ دروازہ کھول کر جو دیکھا تو ایک والا دودمان علوی کھڑے ہیں۔ دو غلام ان کے ساتھ ہیں۔ غلاموں کے سروں پر بہت سا سامان رکھا ہے۔ ان کو دیکھ کر اس علوی نے کہا کہ آپ لوگوں نے میری شکایت دربار رسالت میں کی ہے اور مجھے خواب میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں تمھاری خدمت میں کچھ پہنچا دوں۔ لہذا یہ حاضر ہے۔

اسی طرح حافظ ابو علی بلخی کا یہ واقعہ ہے کہ ایک بار عسقلان میں اپنے عہدِ طالب علمی میں خرچ سے اس قدر تنگ ہوئے کہ متواتر فاقوں پر فاقہ کرنا پڑا۔ آخر جب ضعف نے بے حد تنگ کیا اور لکھنے سے معذور ہو گئے تو ایک نانبائی کی دوکان پر محض اس غرض سے جا بیٹھے کہ کھانے کی خوشبو ہی سے کچھ طبیعت کو تقویت پہنچ جائے۔

یہ سب واقعات حفاظ حدیث کے ہیں۔

حکیم ابونصر فارابی جو اپنے زمانہ میں فلسفہ و سائنس کا مسلم امام گذرا ہے اس کا افلاس کی بدولت عہدِ طالب علمی میں یہ حال تھا کہ مطالعہ کے لیے چراغ کا تیل بھی خریدنے سے معذور تھا تاہم اس کی بلند ہمت اور شوق حصول علم اس کو بیٹھنے نہ دیتا تھا۔ وہ رات کو پاسبانوں کی قندیلوں سے اپنے مطالعہ کا کام لیتا اور آخر اسی تنگ حالی میں اس نے وہ علمی ترقی کی کہ آج دنیا اس کو معلم ثانیؒ کے لقب سے یاد کرتی ہے۔

طلب علم کی غرض سے سفر کے سلسلہ میں ایک زمانہ میں مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ براعظم اور سمندر کا طے کرڈالنا ان کے نزدیک ایک معمولی بات تھی۔ حافظ ابن المقری جن کے فاقوں کا قصہ زمانہ قیام مدینہ میں ابھی آپ سن چکے ہیں ان کا بیان ہے کہ محض ایک نسخہ ابن فضالہ کے حصول کی خاطر میں نے ستر منزل کا سفر کیا تھا اور اس نسخے کی ظاہری حیثیت یہ تھی کہ اگر کسی نانبائی کو اسے دیا جاتا تو وہ

ایک روٹی کے عوض میں بھی اس کو لینا پسند نہ کرتا۔ اب ذرا حساب لگائیے ایک منزل کو اگر معمولی طور پر بارہ میل کی بھی قرار دیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے اگلے علماء کے نزدیک حدیث کی ایک کتاب کے حصول کی خاطر آٹھ سو چالیس میل کی مسافت طے کر ڈالنا ایک معمولی سی بات تھی۔ ان ہی ابن المقری کے سفر کی تفصیل یہ ہے کہ انھوں نے طلب حدیث میں چار مرتبہ مشرق (ممالک ایشیا) کا اور چار مرتبہ مغرب (ممالک افریقہ واندلس) کا سفر کیا تھا، اور دس مرتبہ بیت المقدس گئے تھے، حافظ ابن المفرج کے ذکر میں علامہ ذہبی نے 'تذکرۃ الحفاظ' میں لکھا ہے کہ انھوں نے ابن الاعرابی سے حدیث کا سماع مکہ مکرمہ میں کیا، اور ابن راشد سے دمشق میں اور قاسم بن اصبغ سے قرطبہ میں اور ابن سلیمان سے طرابلس میں اور محمد سے مصر میں اور دیگر شیوخ سے جدہ، صنعاء اور بیت المقدس میں۔ اب ذرا نقشہ اٹھا کر دیکھیے تو آپ کو پتہ چلے گا کہ یہ مذکورہ مقامات تین براعظموں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ قرطبہ یورپ میں ہے، مصر و طرابلس افریقہ میں اور بقیہ مقامات ایشیا میں۔ امام ابو حاتم رازی کا بیان ہے کہ میں نے سماع حدیث کے صلہ میں تین ہزار فرسخ سے زیادہ مسافت پاپیادہ طے کی تھی۔ ایک فرسخ تین میل کا ہوتا ہے اس لیے امام ممدوح کا پیدل سفر نو ہزار میل سے زیادہ کا ہوا اور یہ ان کے سفر کی حد نہیں بلکہ شمار کی حد ہے کیونکہ انھوں نے اسی کے ساتھ یہ بھی تصریح کی تھی کہ بعد میں میں نے میلوں کا شمار کرنا چھوڑ دیا تھا۔

امام نسوی نے مکمل تیس برس سفر طالب علمی ہی کی نذر کر دیے تھے۔ محدثین میں آپ کو ایسے بھی بہت سے ملیں گے کہ جن کے سفر کا آغاز اندلس سے ہوا اور خراسان میں آکر ان کے طلب علم کی پیاس بجھی یا اسی سلسلہ میں بخارا سے چلے تو قیروان تک پہنچ گئے۔

حافظ ابن طاہر مقدسی کا یہ واقعہ ہے کہ انھوں نے جتنے سفر طلب حدیث میں کیے سب پاپیادہ کیے۔ وہ سواری اور بار برداری دونوں کا کام اپنے ہی نفس سے لیتے تھے۔ کتابوں کا پشتارہ باندھا، انھیں پیٹھ پر لادا اور چل کھڑے ہوئے۔ کبھی کبھی ان کی پیادہ روی یہ رنگ

لاتی کہ پیشاب میں خون آنے لگتا۔ ان کے مقامات سفر میں حافظ ذہبی نے چونتیس شہروں کو نام بنام گنایا ہے۔

حافظ ابو عبداللہ اصفہانی نے ایک مرتبہ اپنے مقامات سفر کی تفصیل بیان کرنی شروع کی تو ایک سو بیس شہروں کے نام گناتے چلے گئے۔ حافظ ذہبی نے ان تمام شہروں کے حالات میں جہاں محدثین طلب حدیث کی غرض سے سفر کیا کرتے تھے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جس کا نام ہے "الامصار ذوات الآثار" یعنی حدیثوں کے شہر۔ محدثین اور علمائے دین کے حالات میں جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں وہ سب ان کے اسفار علمیہ کے حالات سے بھری پڑی ہیں، اور پھر یہ سن کر آپ کو تعجب ہوگا کہ یہ سفر علمی کچھ آنکھوں والوں ہی کے ساتھ مختص نہ تھا بلکہ نابینا علماء بھی اس مشقت میں ان کے ساتھ شریک تھے۔ چنانچہ ماوردی نابینا حافظ ابوالعباس رازی کے تذکرہ میں امام ذہبی نے لکھا ہے کہ انھوں نے سماع حدیث کی خاطر بلخ، بخارا، نیشاپور اور بغداد کا سفر کیا تھا۔ یہ واضح رہے کہ بلخ سے بغداد کی مسافت براہ بخارا ۱۳۶۵ میل ہے۔

غرض یہ داستان طویل ہے۔ اتنا سمجھ لیجیے کہ اس عہد میں علم دین کی خاطر ملکوں ملکوں پھرنا، براعظم اور سمندر کو پار کر لینا ایک معمولی سی بات تھی اور جو اس زمانہ میں طلب علم میں قطع منازل سے گھبراتا تھا وہ طعن و ملامت کا نشانہ بنتا تھا۔

اور جس طرح اس زمانہ میں دور دراز کا سفر مسلمان طلباء کا معمول تھا اسی طرح شیوخ و اساتذہ کی کثرت بھی اس عہد کی خاص خصوصیت تھی۔ علماء سلف میں ہم بہت سے ایسے لوگوں کے نام بتلا سکتے ہیں جن کے اساتذہ کی تعداد چار ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ چنانچہ امام اعظم ابوحنیفہؒ امام عبداللہ بن المبارکؒ اور امام طبرانیؒ کا شمار انھیں لوگوں میں ہے۔ اور ایسے علماء تو بکثرت گزرے ہیں کہ جن کے شیوخ کی تعداد ایک ہزار سے متجاوز تھی۔ امام بخاریؒ کا بیان ہے کہ میں نے ایک ہزار اسی (۱۰۸۰) اشخاص سے حدیثیں لکھی ہیں، اور ان میں کوئی ایسا نہیں جو محدث نہ ہو۔

مصنفین صحاح ستہ میں بطور نمونہ صرف امام ابن ماجہ کو لے لیجیے۔ انھوں نے اپنی کتاب 'السنن' میں تین سو دس حضرات سے حدیثیں نقل کی ہیں اور ہم نے ان سب کو نام بنام بقید نسب و وطن اپنی کتاب "امام ابن ماجہ اور علم حدیث" میں ذکر کر دیا ہے۔ اور ان میں جو حضرات حافظِ حدیث کہلاتے تھے ان کا مختصر سا تذکرہ بھی درج کتاب کر دیا ہے۔

عام مسلمانوں میں اس زمانہ میں طلب علم کا جو ذوق تھا اس کا اندازہ آپ اس سے لگا سکتے ہیں کہ عام طور پر مجالس درس میں حاضرین کی تعداد دس ہزار کے قریب قریب ہوتی تھی۔ اور خصوصی مجالس میں یہ تعداد کبھی تیس ہزار، کبھی ستر ہزار اور کبھی ایک لاکھ بیس ہزار تک جا پہنچتی تھی۔ اس قسم کے بعض واقعات ہم نے اپنی مذکورہ بالا کتاب میں تفصیل سے ذکر کیے ہیں۔ استاذ کی آواز کو حاضرین کے گوش گذار کرنے کے لیے جن اشخاص کو مقرر کیا جاتا بعض دفعہ خود ان کی تعداد چار سو تک پہنچ جاتی تھی۔ ان کو مستملی کہا جاتا تھا اور جس طرح تکبیر امام کی تکبیر کو مقتدیوں تک پہنچاتا ہے یہ مجلس درس میں مناسب مقامات پر کھڑے ہو کر اساتذہ کے الفاظ کو حاضرین درس تک پہنچایا کرتے تھے۔

پھر حفظ میں یہ ملکہ بہم پہنچایا تھا کہ ادھر سنتے اور ادھر لوح حافظہ پر ثبت ہو جاتا تھا۔ متقدمین کا ذکر چھوڑیئے متاخرین میں صاحب قاموس کا بیان ہے کہ جب تک دو سو سطریں روزانہ حفظ نہ کر لیتا ہوں رات کو سوتا نہیں۔ ممالک مشرق میں ایک مدت تک یہ معمول تھا کہ جب تک 'مبسوط سرخسی' یا 'ہدایہ کامل' ازبر نہ ہوتا قاضی نہیں بنایا جاتا تھا۔ واضح رہے کہ 'مبسوط سرخسی' تیس جلدوں میں مصر سے طبع ہو کر آئی ہے۔ مصنف نے بھی اس کتاب کو زبانی ہی املا کرایا تھا۔ ہوا یہ کہ شمس الائمہ سرخسی نے حاکم وقت کو کچھ نصیحتیں کی تھیں جن کی پاداش میں انھیں ایک اندھیرے کنوئیں میں نظر بند کر دیا گیا تھا۔ نہ کوئی کتاب ان کے پاس تھی اور نہ کاغذ و قلم دوات۔ تلامذہ کنوئیں کی منڈیر پر آ کر بیٹھ جاتے یہ نیچے سے املا کراتے جاتے اور وہ اوپر بیٹھے لکھا کرتے تھے۔ محدثین کے واقعات تو اس سلسلہ میں اس کثرت سے ہیں کہ ان کا شمار مشکل ہے۔

پھر سرعت تحریر کی مشق کا یہ عالم تھا کہ علامہ عینی کے تذکرہ میں منقول ہے کہ انھوں نے ایک رات میں پوری "مختصر قدوری" نقل کر ڈالی تھی۔ امام طبری کی تصانیف کا اوسط ابتداء شباب سے یوم وفات تک لگایا گیا تو دو جزو یومیہ نکلا۔ اور اس کے علاوہ عام تحریر کا چالیس ورق روزانہ۔ ان کی وفات پر بارہ سیر سیاہی کا حساب لگایا گیا تھا۔ حافظ ابن جوزی نے ایک بار بر سر منبر کہا تھا کہ میں نے اپنی ان انگلیوں سے دو ہزار جلدیں لکھی ہیں۔ انھوں نے یہ بھی وصیت کی تھی کہ میرے قلم کے تراشہ سے میرے مرنے کے بعد غسل کے لیے پانی گرم کیا جائے۔ چنانچہ وہ تراشہ اتنا وافر نکلا کہ امام موصوف کی وصیت کی تعمیل بوجہ احسن ہو گئی۔

انہماک علمی کا یہ حال تھا کہ رات کو عشاء کے بعد کسی علمی مسئلہ پر گفتگو شروع ہوتی تو کھڑے کھڑے صبح کی اذان ہو جاتی اور پتہ بھی نہ چلتا کہ رات کتنی بیت گئی۔ امام زفر اور قاضی ابو یوسف کے ساتھ ایسا ہی ہوا ہے۔ اسی طرح امام ابن مبارک اور علی بن الحسن نے بھی سردیوں کی ایک رات یونہی کھڑے کھڑے مذاکرہ میں ختم کر دی تھی۔ امام محمد گرمی کی راتوں میں پانی کے ٹب میں بیٹھ کر اپنی تصانیف کو قلمبند کرتے تھے۔

پھر کتب خانوں اور مدارس کا ایک الگ باب ہے۔ جرجی زیدان نے اپنی کتاب "تاریخ التمدن الاسلامی" میں تصریح کی ہے کہ:

"مسلمانوں کے عہد میں مکتبہ سابور میں کتابوں کی تعداد دس ہزار، قرطبہ کے "مکتبۃ الحکم" میں چار لاکھ، قاہرہ کے "خزائن القصور" میں دس لاکھ، "دارالحکمۃ" میں ایک لاکھ، "مکتبہ طرابلس" میں تیس لاکھ، اور "مکتبہ مراغہ" میں چار لاکھ تھی۔"

غرض مسلمانوں کی علمی خدمت کے کس کس شعبہ پر بحث کی جائے۔ وقت تھوڑا مضمون وسیع اب اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار — گلچین جمال تو ز داماں گلہ دارد